مکروہ جمہوریت اور ریاستی دہشت گردی:
امریکہ میں نئی مطلق العنانیت کی سیاست

تحریر: ہنری اے جیراکس*
ترجمہ: محمد سلیم ظفر، میمونہ اقبال

''بنیاد پرستی، خواہ مذہبی بنیادوں پر استوار ہو یا مذہب بیزاری پر، بجائے خود ایک مذہب اور عقیدے کی حیثیت اختیار کر کے پورے وثوق سے یہ دعویٰ کرتی ہے کہ حقیقت کی صورت گری کا صرف اور صرف ایک طریقہ ہے۔ اس کا ایک تقاضا یہ بھی رہتا ہے کہ ہر کوئی اسی موقف کو درست سمجھے بصورتِ دیگر معاشرتی مقاطعے، اور بعض صورتوں میں تو جہنم واصل ہونے تک کے لیے خود کو تیار رکھے۔ معاشی آزادی ان سب کو بے بہا عطا کی جاتی ہے جو عالمی بنک سے قرضہ حاصل کرنا چاہتے ہیں اور عالمی مالیاتی فنڈ کا بھی یہی مطالبہ ہے کہ نجکاری کریں یا معدوم ہو جائیں، اور ناصحانہ رائے دی جاتی ہے کہ سب کچھ، حتیٰ کہ اپنی معاشرتی زندگی کو بھی، منڈی کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے۔ مالی سرمایہ کاری کی یہ بنیاد پرستی اور منڈی کو عالمی دیوتا کے مقام تک پہنچا دینے سے دوسری بہت سی مذہبی یا غیر مذہبی بنیاد پرستیاں جنم لیتی ہیں جو یا تو ان کی اتحادی ہو جاتی ہیں یا ان کی مخالف۔ یہ طاقتیں عالمگیریت کی بنیاد ہیں''**۔

نیو یارک ٹائمز کے بش انتظامیہ کے اس فیصلے سے متعلق حالیہ انکشافات، جس میں ادارہ برائے قومی سلامتی (National Security Agency) کو اجازت دی گئی کہ وہ بغیر اجازت نامہ حاصل

---

* ہنری اے جیراکس میک ماسٹر یونیورسٹی، کینیڈا کے گلوبل ٹی وی نیٹ ورک میں چیئرمین ہیں۔ ان کی زیر مطالعہ تصنیف ''کمپیریٹیو سٹڈیز آف ساؤتھ ایشیا، افریقہ اینڈ مڈل ایسٹ'' کے شمارہ ۲:۲۶، ۲۰۰۶ء میں شائع ہوئی ہے۔

**Ngugi Wa Thiong 'O, "Europhone or African Memory: The Challenge of the Pan-Africanist Intellectual in the Era of Globalization".

کیے امریکیوں کی جاسوسی کریں؛ واشنگٹن پوسٹ میں مرکزی خفیہ خبر رساں ادارے (C.I.A) کے آٹھ ملکوں میں قائم کردہ خفیہ قید خانوں (جنہیں ''اندھیری کوٹھریوں'' کے نام سے جانا جاتا ہے)، کے جال کا انکشاف؛ بے انتہا بدعنوانی، جس میں بش انتظامیہ کے بعض طاقت ورترین سیاست دان شامل ہیں، اور عراق اور افغانستان میں اذیت اور ذلت آمیز سلوک کی کثرت کے متعلق جاری وساری واقعات زبانِ زدِ عام خبروں میں سے صرف چند جھلکیاں ہیں جو امریکی زندگی میں بڑھتی ہوئی مطلق العنانیت کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

جیسا کہ سیمر-ایم-حرش سے لے کر گورووڈل (Gorevdal) اور رابرٹ کینیڈی جونیئر (Robret Canady Jr.) تک بہت سے جرأت منداور نامور ناقدین نے توجہ دلائی ہے کہ حکومت اس وقت شدت پسندوں کے ہاتھوں میں ہے جنہوں نے شہری آزادی کی دھجیاں بکھیر دی ہیں، نوجوان امریکی فوجیوں کو عراق بھیجنے کو قانونی شکل دینے کے لیے امریکی عوام سے جھوٹ بولے گئے ہیں اور مغرور طاقت کے ننگے استعمال سے عالمی برادری کی اکثریت کو امریکہ سے دور کر دیا ہے۔ ان دائیں بازو والے شدت پسندوں نے مکروہ تجارتی اتحاد بنا کر حکومت کے اعلیٰ اداروں کو داغدار کر دیا ہے۔ سیاسی طاقت کو ایسی قانون ساز حکمت عملیاں بنانے کے لیے بے شرمی سے استعمال کیا گیا ہے جو امیر کو فائدہ دے اور غریب کو سزا، اور ان عوامی اداروں کو ناکارہ بنا دیا ہے جو منڈی کی منطق کے ماتحت نہیں چلتے تھے۔ نئی امریکی استعماریت کے نتائج عالمی جمہوریت کے لیے بھی کچھ کم ڈرامائی نہیں ہیں۔

امریکہ میں غریب نوجوانوں اور مختلف رنگت کے لوگوں کے خلاف ایک خاموش جنگ جاری ہے۔ انہیں یا تو غیر معیاری سکولوں میں ٹھونسا جارہا ہے یا خطرناک حد تک بڑھتی ہوئی شرح سے جیلوں میں بھرا جا رہا ہے۔ لیکن (اس جنگ کا) صرف وہی نشانہ نہیں ہیں۔ جامعات کو دہشت گردی پر نرمی کا مظاہرہ کرنے اور بش انتظامیہ پر تنقید کرنے کے باعث غیر امریکی (فطرت دکھانے) کا الزام لگایا جارہا ہے۔ داخلی خوف ری پبلکن پارٹی کا نمائشی نظریہ بن گیا ہے اور بش کے راسخ العقیدہ عیسائی حامی عورتوں کی افزائش نسل کے حقوق پر پوری قوت کے ساتھ حملے کرنے میں سب سے آگے ہیں۔ اب جب کہ مختلف رنگت کے لوگوں، غرباء، نوجوانوں، متوسط طبقے، کہن سال حضرات، ہم جنس پرستوں اور عورتوں کے قانونی حقوق

اور امدادِ خدمات پر یورش کی جا رہی ہے، موجودہ انتظامیہ مذہب اور ریاست کے درمیان قائم حدود کو توڑنے کی کوششوں کی اتنی حمایت کر رہی ہے کہ ''فرینک رچ'' (Frank Rich) جیسے آزاد خیال ناقدین بھی پُر یقین ہیں کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ ایک بنیاد پرست مذہبی ریاست بننے کے دہانے پر پہنچ گئی ہے۔

جیسے جیسے جنگ امریکی استعماریت سے بھرپور خارجہ حکمتِ عملی کی بنیاد بنتی جا رہی ہے، حقیقی اور علامتی تشدد کچھ اور غیر جمہوری رجحانات کے ساتھ مل کر دنیا کو مزید خطرناک بنا رہے ہیں اور عالمگیر جمہوریت کے وعدے کا تصور تاریخ کے موجودہ لمحات میں مشکل تر ہوتا جا رہا ہے۔ دائیں بازو کے ذرائع ابلاغ کی طرف سے دکھائی جانے والی ماورائے قومیتی کی خیالی تصویر (جو کہ اب بش انتظامیہ کے ایوان کی آواز ہے)، نے عسکری علامات کو امریکی ثقافت میں مکمل طور پر پھیلا دیا ہے، جو گئے دور کی آبادیاتی نظام کی شکلوں جیسی نسلی درجہ بندی پر دلالت کرتی نظر آتی ہے۔ نظریۂ حب الوطنی کی درشتگی اور مذہبی جنونیت کی زبان نے سماجی انصاف اور برابری کی جگہ لے لی ہے جو کہ فسطائی (Fascist) نظریات اور اصولوں کی اگر بحالی نہیں تو کم از کم ان کی طرف زبردست کشش اور رجحان کا ثبوت ضرور دیتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جنگ اور جنگجو قومی عظمت کے محبوب ترین نمونے بن چکے ہیں۔ امریکہ کے تصورِ حاکمیت نے نہ صرف نہ ختم ہونے والی دہشت گردی کے خلاف جنگ کو قانونی طور پر جائز کر دیا ہے، بلکہ غیر جمہوری اور جنگ آور وطن پرستی کے سیاسی اصول کو تحریک دینے سے عالمی جمہوریت کو بھی خطرے میں ڈال دیا ہے۔

امریکہ اپنے عالمگیر مفاد کے لیے عالمیت (کے تصور) کا انکار کر کے حیاتیاتی سیاست (Bio politics) کے سہارے حاکمیت کے ایسے نظریے کو حیاتِ نو دے رہا ہے جس میں جنگی تشدد اور خطرات کے باعث طاقت کے زور پر ہونے والی کارروائیاں روزمرہ زندگی میں سرایت کر چکی ہیں۔ انسانوں کو ملکی اور بین الاقوامی قوانین کا تحفظ اب مزید میسر نہیں ہے اور ریاستی تشدد اور استعماری بدمعاشی خود ریاست کی پہچان بن گئے ہیں۔ حیاتیاتی طاقت (Bio power)، قانون اور تشدد میں تمیز نہیں کی جا سکتی اور حاکمیت صرف اس دہشت گردی کے خلاف جنگ بپا کرنے تک محدود ہو گئی ہے جس سے بذاتِ خود وہی دہشت پیدا ہو رہی ہے جس کے خلاف برسرِ پیکار ہونے کا یہ دعویٰ کرتی ہے۔ اس تصور حاکمیت میں ریاستی تشدد کو

تحفظ دے کر اسے دہشت گردی کی ملی جلی طاقتوں کے گرد منظم کیا جا رہا ہے جو تیزی سے ایک ایسے خوفناک نظام کی شکل اختیار کر رہا ہے جس سے وہ ایک دوسرے کے کرتوتوں کی توجیہہ بھی پیش کرتے ہیں اور اسے نام نہاد قانون کا تحفظ بھی دیتے ہیں۔

کلنٹن انتظامیہ نے اپنا بنیادی محور و مرکز بیت المال (Department of the Treasury) کو بنایا تھا جب کہ نئی بش انتظامیہ خارجہ حکمتِ عملی وضع کرنے کے لیے اپنے ماہرینِ دفاع (ڈِک چینی، رمز فیلڈ اور رائس) کی طرف رُخ کرتی ہے اور اندرونِ ملک تنظیمِ عیسائیت پر بھروسہ رکھتی ہے۔ حاکمیت اور طاقت کے اس تصور میں بش اور اس کے مشیر داخلی اور خارجی ضابطے کے درمیان موجود تعلق کو بہت اچھی طرح سمجھ چکے ہیں۔ انہوں نے ارینڈٹ (Arentdt) کے نظریے کو اتفاقی طور پر قبول کر لیا ہے جس کے مطابق ملکی حدود سے باہر قائم کی گئی سلطنت ملک میں ظلم و تشدد کی فضا قائم کرنے کا باعث بنتی ہے لیکن وہ اس نظریے کی مختلف انداز میں اس طرح تشریح کرتے ہیں کہ بیرون ملک فوجی سرگرمیوں کے لیے اندرونِ ملک فوجی نظم وضبط کی ضرورت ہوتی ہے۔

جارجیو ایگیمبن کے حسب موقع منتخب الفاظ میں ''جب ہنگامی حالات کی کیفیت شاذ و نادر نہیں رہتی بلکہ معمول بن جاتی ہے تو چند طاقت ور غیر جمہوری رجحانات امریکی اور عالمگیر جمہوریت کے خوش آئند امکانات کے لیے خطرہ بن جاتے ہیں''۔

ان غیر جمہوری رجحانات میں سرفہرست خود منڈی کی بنیاد پرستی ہے جس نے نہ صرف جمہوری اقدار اور عوامی خدشات کو حقیر بنا دیا ہے بلکہ انفرادی انانیت کی وباء، کثیر منافع کی تگ و دو اور سماجی ڈارون ازم، (جو بدقسمتی کو کمزوری سمجھتا ہے)، کو اپنی پناہ میں لے لیا ہے۔ ان تمام محرکات کی یکجائی سے ''تمام کی جنگ تمام کے خلاف'' کا ہابیسن (Hobbesion) اصول جنم لے رہا ہے جس نے مشترکہ ذمہ داری اور دوسروں کے لیے جذبۂ ہمدردی کی جگہ لینی شروع کر دی ہے۔ منڈی کی اقدار اور محاصل سرمایہ کی ظالمانہ کاری گری باقی ماندہ معاشرے کو منظم کرنے کا طریقہ کار بنتی جا رہی ہے۔ بار بار دہرائے جانے والے جدید آزاد خیال منتر ''نجکاری کرو یا معدوم ہو جاؤ'' کے زیر اثر ہر شخص ایک گاہک کے طور پر دیکھا جاتا ہے اور ہر رشتہ مؤثر بہ لاگت کے اصول پر جانچا جاتا ہے۔ ذمہ دار شہریوں کی جگہ کاروباری حضرات کے

گروہ نے لے لی ہے، جن میں سے ہر ایک خود کفالت کی خصوصیات سے بھرپور ہے اور وہ تنہا ہی سماجی نظم وضبط کے بڑھتے ہوئے مشکل چیلنج کا سامنا کرنے پر مجبور بھی ہے۔ ایسے حالات میں آزادی کا مطلب برابری، سماجی انصاف اور عوامی بہبود کا حصول نہیں رہا بلکہ اشیاء، محاصل سرمایہ اور مصنوعات کی نہ رکنے والی تجارت کا نام بن گیا ہے۔ ایک طرف سرمائے کی منطق جمہوری حاکمیت کا ڈھنڈورا پیٹ رہی ہے اور دوسری طرف اندرونِ ملک چھوٹے پیانے پر ہونے والی جنگ جمہوری آزادی کے حصے بخرے کر رہی ہے اور بیرونِ ملک بڑے پیانے پر ہونے والی جنگ میں بموں، ٹینکوں اور کیمیائی جنگ کی مدد سے جمہوریت پہنچائی جا رہی ہے۔

انسانوں کو پہنچنے والی بے انتہا اذیت اور موت وہ قیمت ہے جو دنیا نے جدید آزاد خیالی کے ساتھ گہرے تعلق کی بابت ادا کی ہے۔ یہ تکالیف افواج پر قبضہ کرنے کے لیے وحشیانہ طریقے سے پھینکے گئے بموں کی شکل میں ہی نہیں پہنچیں بلکہ عالمی بنک اور بین الاقوامی مالیاتی فنڈ جیسے عالمی مالیاتی اداروں کی طرف سے حکمت عملی میں ایسی بڑی تبدیلیاں بھی لائی گئیں جن میں زمین، وسائل، منافع اور اشیاء کے حصول کی ہوس شامل تھی۔ عالمگیر لاقانونیت اور مسلح تشدد، آزاد تجارت کے اہم عناصر، غیر محدود منڈی کے فوائد اور عسکری حل کے ذریعے نافذ کی گئی مغربی انداز کی جمہوریت کے وعدے (جو بڑے پیانے پر معاشی حاکمیت کے دور میں بڑھ رہے ہیں)، ایک دوسرے کے ہم قدم ہیں۔ ان حالات میں انسانی تکالیف اور اذیتیں ایسی سطح پر پہنچ چکی ہیں جن کی مثال نہیں ملتی۔

آج ایک ارب سے زیادہ بچے غربت، جنگ اور ایڈز جیسی بیماریوں کی بدولت شدید محرومی کا شکار ہیں۔ مخصوص اعداد وشمار دل دہلا دینے والے ہیں۔ ۶۴ کروڑ بچوں کو مناسب چھت میسر نہیں، ۴۰ کروڑ بچوں کو پینے کا صاف پانی میسر نہیں، ۲۷ کروڑ بچوں کی بنیادی صحت عامہ کی سہولیات تک رسائی نہیں ہے۔ ۱۵ کروڑ بچے ایڈز کی وجہ سے یتیم ہوگئے ہیں۔ صرف ۱۹۹۰ء کی دہائی کے دوران ۲۰ کروڑ بچوں کو جنگ کی وجہ سے گھروں کو چھوڑنا پڑا۔

کینز (Keynes) کے معاشی نظریات کی موت اور حکومتی مداخلت کے بغیر بڑھنے والی آزاد منڈی کے تصور کے غالب آجانے کے بعد غریبوں، نوجوانوں اور بوڑھوں کو معاشرتی ضروریات بہم

پہنچانے کے بجائے اب سرمائے کا اکٹھا کرنا مجبوری بن گیا ہے۔ جدید آزاد خیالی کے وکلاء ریاستی بہبود کے فوائد کے خلاف جنگ کرتے دکھائے دیتے ہیں، اور عوامی ضروریات کی اجتماعی فراہمی کے وعدے کو ترک کر کے نہایت سفاکی سے غریب، بے گھر، بوڑھے اور معذور افراد کو اپنی ذاتی زندگی کے لیے بھاگ دوڑ کرنے کی ترغیب دلاتے ہیں۔ حکومت کے کھوکھلا ہو جانے سے نجکاری نے معاشرے کے ہر شعبہ کو متاثر کیا ہے۔ اسی طرح حکومت کے عوامی مفاد اور عوامی ضروریاتِ زندگی کے محافظ کا کردار ترک کر دینے سے ردعمل کی سیاست نے جمہوری طریقۂ حکومت کی جگہ لے لی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ غریب اور امیر کے درمیان فرق بڑھتا جا رہا ہے اور لاکھوں امریکی غربت اور مایوسی کی گھاٹیوں میں گرے جا رہے ہیں۔ نسل اور طبقہ کی تقسیم کے ساتھ ساتھ غربت، نسلی تعصب اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں ایسی تلخ حقیقتیں ہیں جو مختلف پریشان کن اعداد و شمار سے ظاہر ہیں۔

عالمی ادارۂ خوراک کے اعداد و شمار کے مطابق، امریکہ کے ۳ء۵ فیصد گھرانے بھوک کا شکار ہیں جو کہ ۹۶ لاکھ افراد بنتے ہیں جن میں ۳۰ لاکھ بچے بھی شامل ہیں۔ بچے اگرچہ پوری آبادی کا صرف ۲ فیصد ہیں، لیکن وہ غریب عوام کا ۳۹ فیصد ہیں۔ یونیسیف کے بیان کے مطابق امریکہ اگرچہ ابھی تک روئے زمین پر امیر ترین ملک ہے جس کی آمدنی دوسرے کسی بھی ملک سے زیادہ ہے لیکن اس میں غریب بچوں کی تعداد بھی صنعتی اور دولت مند ممالک کے مقابلے میں سب سے زیادہ ہے۔ امریکہ میں ۱۷ فیصد بچے غربت میں رہتے ہیں۔ اقلیتی بچوں میں غربت کی شرح سفید فام بچوں کی نسبت کافی زیادہ ہے۔ مثال کے طور پر ۳ سال سے کم عمر کے سیاہ فام اور ہسپانوی بچوں میں غربت کی شرح سفید فام بچوں سے ۳ گنا زیادہ ہے۔ اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ افریقی نژاد امریکیوں میں غربت کی سطح ۲۴ء۷ فیصد، ہسپانویوں میں ۲۱ء۹ فیصد اور غیر ہسپانوی سفید فاموں میں ۸ء۶ فیصد ہے۔

مزدور انجمنوں جیسی طاقتیں (جنہوں نے کسی دور میں معاشی اور سیاسی کاروبار کو لگام دیے رکھی)، ختم ہو جانے سے غیر جمہوری رجحانات جنم لے رہے ہیں۔ امریکہ اندرونِ ملک تو ایسی انجمنوں میں رکنیت حاصل کرنے والوں کے خلاف برسرپیکار رہے ہی، جن میں اب نجی شعبہ میں صرف ۷ء۹ فیصد مزدور رہ گئے ہیں، اس کے ساتھ ساتھ پوری دنیا کے منظم مزدوروں پر جدید آزاد خیالی کے حملے پوری قوت سے

جاری ہیں۔ بش انتظامیہ کی جدید آزاد خیالی کی وباء سے ایسی عالمی حکمت عملیاں بن رہی ہیں جو ماحول کے لیے بھی خطرہ ہیں۔ کیوٹو پروٹوکول (جو کہ دنیا میں حرارت کو کم کرنے اور گرین ہاؤس سے نکلنے والی گیس کو قابو میں رکھنے کے لیے تیار کیا گیا تھا)، پر دستخط سے انکار کر کے بش انتظامیہ نے ان خطرات کو صحیح ثابت کر دیا ہے۔ مزید یہ کہ امریکہ ۲۰۰۱ء میں جی-ایٹ (آٹھ ممالک کا گروہ) کی طرف سے پیش کیے گئے بین اقوامی منصوبہ برائے شفاف توانائی (International Plan for cleaner Energy) کی مخالفت کرنے والا دنیا کا واحد ملک ہے۔ ایک بار پھر بش حکومت کی مطلق العنانیت حیاتیاتی سیاست کی اس زہریلی شکل کی نمائندگی کرتی نظر آتی ہے جس میں بے مقصد ہلاکتیں بھی خاص طور پر اس وقت قابل قبول نظر آتی ہیں، جب ''معدوم کی جا سکنے والی آبادی'' عالمگیر سرمایہ دارانہ اجارہ داری کے (سرمایہ کی) یکجائی کے نظام میں مداخلت کرتی ہے۔ بڑھتی ہوئی غیر مساوی تقسیم، دنیا میں حرارت کا بڑھنا، ساری دنیا میں سطح سمندر کا بڑھ جانا، زمین پر بازگشت کے نظام کا زوال پذیر ہو جانا، اور بہت سے پودوں اور جانوروں کی نسلوں کا معدوم ہو جانا بش انتظامیہ کے لیے منڈی کی بنیاد پرستی کی منطق اور اس سے حاصل ہونے والے انعامات کی نسبت ایک حقیر قیمت ہے۔ اس کے نتائج نہ صرف امریکہ بلکہ پوری دنیا کو متاثر کر رہے ہیں، خاص طور پر ان قوموں کو جن کے پاس کوڑا کرکٹ، ماحولیاتی مضرات اور معاشی لوٹ مار (جو اُن کی دیہی، شہری، اور روزمرہ زندگی پر اثر ڈالتی ہیں)، سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے کوئی آڑ میسر نہیں۔ ایسے حالات میں امید ساتھ چھوڑ رہی ہے اور سرمایہ دارانہ نظام سے بچ کے زندگی گزارنا یا ایسی سیاست پر یقین رکھنا جو جمہوریت کے معاملات کو سنجیدگی سے لے، انتہائی مشکل ہوتا جا رہا ہے۔

دوسرے نمبر پر جو بنیاد پرستی امریکہ پر اثر انداز ہو رہی ہے اسے بش اور اس کے حواریوں کے مذہبی جوش و خروش کے آئینے میں دیکھا جا سکتا ہے جس کی وجہ سے تنقیدی سوچ اور سماجی ذمہ داری کی جگہ اندھے اعتقاد اور عدم رواداری جیسے عناصر نے لے لی ہے۔ بش انتظامیہ کے حکومتی اہلکاروں میں سے اکثر حضرات راسخ العقیدہ عیسائیت کے داعی ہیں جو ریاست اور مذہب کے درمیان موجود لکیر کو ختم کر رہے ہیں۔ اور اس راسخ العقیدہ عیسائیت کو امریکی معاشرے میں سخت اخلاقی اصولوں اور اقدار کے ساتھ نافذ کرنے کے درپے ہیں۔ یہ اقدار غربت، نسلی تعصب، حفظانِ صحت کے بحران اور امریکی بچوں میں بڑھتی

ہوئی غربت جیسے اصل سماجی مسائل کے بارے میں بے حس ہی نہیں بلکہ انہیں مذہبی کٹر پن، تعصب اور بے رحمی کے جذبات کے ساتھ دیکھتے ہیں۔ان مسائل کو حل کرنے کی بجائے یہ راسخ العقیدہ عیسائی بہت بڑی سیاسی طاقت کے ساتھ ہم جنس پرست شادیوں پر پابندی، سائنس کی بجائے تخلیق کاری کا ساتھ دینے، سماجی تحفظ کی نجکاری کرنے اور اسقاطِ حمل کے حق کو دبانے کے لیے مہم چلا رہے ہیں۔بھری ہوئی غیر دانش مندی کے نظریات طالبان جیسی اخلاقیات کے ساتھ مل کر بڑی جرأت کے ساتھ روزمرہ ثقافتی رویوں اور ریاستی حکمت عملیوں میں ڈھلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ پیٹ رابرٹسن (Pat Robertson)، جیمز ڈابسن (James Dobson) اور جیری فالویل (Jerry Falwell) جیسے دائیں بازو کے راسخ العقیدہ عیسائی عوامی اور خارجہ پالیسی کے مسائل پر عوامی موشگافیاں کرنے کے ساتھ ساتھ وائٹ ہاؤس کے ساتھ بھی قریبی تعلقات استوار رکھے ہوئے ہیں۔مثال کے طور پر بش انتظامیہ کے پسندیدہ رابرٹسن نے وینزویلا کے صدر ہوگوشیویز کے قتل کا مطالبہ کیا ہے اور یہ خیال پیش کیا ہے کہ اسرائیل کے وزیراعظم ایریل شیرون کو دل کا شدید دورہ پڑنا ایک خدائی سزا ہے جو اسے پچھلے موسم گرما میں غزہ سے اسرائیل کو باہر نکالنے پر دی گئی۔مزید یہ کہ بہت سے قدامت پسند عیسائیوں نے ''دہشت گردی'' کے خلاف جنگ کو ''مقدس جنگ'' کا نام دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے اور مشرقِ وسطیٰ پر ایسی حکمت عملیاں تیار کرنے میں بش انتظامیہ کی مدد کی ہے جن میں دہشت گردی کے خلاف جنگ اور فلسطینی حقوق اور حاکمیت پر حملوں کو قانونی شکل دینا ہے۔''حقوقِ عیسائیت'' نے نہ صرف اسلام کے خلاف اپنے غصے کا اظہار کیا ہے بلکہ اس نے ایسے عوامی بیانات بھی جاری کیے ہیں جو اتنے انتہا پسند خیالات پر مبنی ہیں کہ انہیں عرب دنیا میں بڑے غصے کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔اس کی وجہ سے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے خلاف نفرت کو مزید ہوا ملی ہے اور اسلامی دہشت گردوں کی بھرتی کے لیے ایک آلہ مل گیا ہے۔ایستھر کیپلن (Esther Kaplan) نے اسلام کے خلاف اس سے بھی زیادہ شدت پسند آراء کی تدوین پیش کی ہے۔وہ لکھتی ہے: ''راسخ العقیدہ عیسائی بلی گراہم (Bilay Graham) کے بیٹے فرینکلن گراہم (Franklin Graham)، (جسے صدر بش نے مذہبی بیداری کا فریضہ سرانجام دینے پر خراجِ تحسین پیش کیا ہے اور جس نے بش کے صدر بننے کی تقریب میں دعا کرائی تھی)، نے ٹیلی ویژن پر اسلام کو ایک بہت ''شیطانی اور فاسد مذہب'' کہا ہے۔

ایک کروڑ ساٹھ لاکھ اراکین پر مشتمل ایک مذہبی جماعت ''جنوبی بپتسما'' (جس کے انتظامیہ سے بڑے مضبوط تعلقات ہیں)، کے سابق صدر عزت مآب جیری وائنز (Jerry Vines) کے مسلمانوں کے پیغمبر (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو (نعوذ باللہ) دہشت گرد قرار دینے پر ہندوستان کے شہر شعلہ پور میں مظاہرے شروع ہوگئے جن میں ۱۹ افراد ہلاک اور ۱۰۰ زخمی ہوگئے۔ قدامت پسند راسخ العقیدہ عیسائیوں کے حکومت سے قریبی تعلقات کی بناء پر ان کے انتہا پسند خیالات کو حکومتی ایوانوں میں بڑی پذیرائی حاصل ہوئی۔ یہ قدامت پسند عیسائی بُش کو ووٹ دینے والے افراد کا چالیس فیصد ہیں۔ اسی طرح ری پبلکن جماعت کا انجیل پڑھنے والا جدید قدامت پسند گروہ (جس میں نائب صدر چینی، سیکرٹری دفاع رمز فیلڈ، سیکرٹری آف سٹیٹ رائس، رچرڈ پرل، پال وولف وٹز اور ڈگلس فیتھ شامل ہیں)، سخت اخلاقی اصولوں کو نافذ کرنے کا حامی ہے اور دائیں بازو والے راسخ العقیدہ عیسائی حامیوں کی انتخابات میں حمایت کو دل سے قبول کرتا ہے۔ طاقت غرور کو جنم دیتی ہے اور بنیاد پرست عیسائیوں اور جدید قدامت پسند سلطنت کے معماروں نے اس بنیادی سچ کو قبول کرلیا ہے کہ امریکہ کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے عالمی مفادات کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے دنیا کو تبدیل کردے۔ بیرون ملک اخلاقیات بانٹنے کے عمل نے مقدس جنگ کے نظریے کو ہوا دی، اور تیل کے لیے لڑی جانے والی جنگ کی تلخی کو کم کرنے کے لیے جمہوریت کے نعرے کا استعمال کیا گیا، جبکہ بُش کے انداز کی اخلاقیات نے اندرونِ ملک خواتین کے افزائشِ نسل کے حقوق کے خلاف جنگ برپا کردی ہے۔

راسخ العقیدہ بنیاد پرست عیسائیوں کی مذہبی عقائد کو سخت اخلاقیات کے ساتھ مدغم کرنے کا براہِ راست اثر یہ ہوا کہ جو لوگ ان سے متفق نہیں انہیں بھی قدامت پسند دوا فروشوں سے (اسقاطِ حمل کی ادویہ) لینے میں مشکل پیش آتی ہے۔ ادویات، سیاست اور مذہب کے اختلاط کا مطلب یہ ہے کہ چند عورتیں افزائش نسل کو روکنے والی ادویات یا دوسری بہت سی مصنوعات جن سے حمل رُک سکے، حاصل نہیں کرسکتیں۔ اسی طرح سے بُش انتظامیہ نے مذہبی بنیاد پرستوں کے دباؤ میں آکر حکومتی ویب سائٹس سے افزائش نسل کو روکنے کی مختلف متبادل شکلوں کو ختم کردیا ہے اور بہت سی جھوٹی سائنسی معلومات لکھوادی ہیں مثلاً افزائش نسل روکنے کی ادویات سے چھاتی کا سرطان ہوتا ہے اور امریکہ میں ۱۳ سے ۱۹ برس کی عمر کے

ہم جنس پرست مردوں میں سے نصف ایچ آئی وی (HIV) کا شکار ہیں۔

بش کی شدید مذہبی انتہا پسندی نے تنقیدی سوچ کے خلاف نفرت پیدا کی ہے، رجعت پسند سماجی حکمت عملیاں وضع کی ہیں اور اندرونی (خطرات کا) خوف اور مذہبی فرمان روائی جیسی قابل نفرت چیزوں کو فروغ دیا ہے۔ اس سے شاید سائنسی غور فکر کی تحقیر ہوتی ہے، بحث ومباحثے رک جاتے ہیں اور تنقید تاریخ کے غبار میں گم ہو جاتی ہے۔ ان چند مواقع کو بھی ایمان کی گرانی تصور کیا جاتا ہے، جن میں دائیں بازو کے مذہبی (افراد) بحث ومباحثہ اور بات چیت کی دعوت دیتے ہیں۔ ۲۵ دسمبر ۲۰۰۵ء سے پہلے بہت سے بنیاد پرست عیسائیوں نے ذرائع ابلاغ کے خلاف ایک مہم کا آغاز کیا جس میں ان کا دعویٰ یہ تھا کہ کرسمس لادینی قوتوں کے مکمل حصار میں ہے جنہوں نے سامی (یہودی) نسل کے مخالفین کا روایتی روپ دھارا ہوا ہے۔ اس روایت کا آغاز ۱۹۲۱ء میں ہینری فورڈ کی بدنامِ زمانہ کتاب ''بین الاقوامی یہودی'' (The Intl. Jew) کی اشاعت سے ہوا تھا۔ امریکی سیاست اور ثقافت کے منظرنامے میں مذہبی انتہا پسندی کے اثرات کو اگر قلم بند کیا جائے تو یہ ''امریکی ثقافت کی نامعقول دیوانگی کے باب'' سے بھی بڑھ جاتے ہیں۔ یہ اثرات واضح طور پر دکھاتے ہیں کہ کس مذہبی انتہا پسندی کا امریکی سیاست کے اونچے طاقت ور ایوانوں اور ذرائع ابلاغ کے نمایاں اداروں میں کس گرم جوشی سے استقبال کیا جاتا ہے، اور کس طرح دونوں طبقے مذہبی افراد کی (ان کے برے افعال میں) مدد کرتے ہیں۔ اب تو مذہبی انتہا پسندی امریکی تاریخ کی ایک پرانی کہانی ہو چکی ہے، لیکن عیسائی بنیاد پرستی کا (امریکی زندگی پر) حالیہ غلبہ پہلے کبھی نہیں دیکھا گیا، جسے بنیاد بنا کر یہ بنیاد پرست داخلی اور خارجی حکمتِ عملیاں بنا رہے ہیں۔ اس سے اندرونِ و بیرونِ ملک جمہوریت کے منہا ہو جانے کا خطرہ مزید بڑھ گیا ہے۔

تیسرا غیر جمہوری عقیدہ بش انتظامیہ کے ان بے رحم اقدامات میں نظر آتا ہے جن کے ذریعے ایسی تنقیدی تعلیم، کو تباہ کرنے کے لیے جدوجہد کی جا رہی ہے جو ذمہ دار شہریت اور قابلِ تعریف جمہوریت کی بنیاد ہے۔ تعلیم کو کاروبار بنانے، اقلیتی اور غریب بچوں کو محروم کرنے، نصاب کو ایک معیار پر لے آنے، سرکاری سکولوں کی نجکاری کرنے اور انتظامِ حکومت میں کاروباری زبان استعمال کرنے جیسی کوششوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ کس طرح متنوع اور (مذہب سے) آزاد تنقیدی سوچ کو نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ جامعات

کے حلقۂ اساتذہ کو کمزور بنانے، مستقل ملازمتوں کو محدود گھنٹوں والی مشروط نوکریوں میں تبدیل کر دینے اور معاشرے میں بڑے پیمانے پر تعلیمی اداروں کو چھوٹے کاروباری مفاد پرست گروہوں کے سپرد کر دینے سے بھی ان سرکاری کاروباری اداروں اور جدید قدامت پسند نظریات کی کوششوں کی نشان دہی ہوتی ہے۔

ڈیوڈ ہاروویٹز(David Horowitz)اور لن چینی(Lynne Cheney) جیسے دائیں بازو کے نظریات کے حامل افراد نے اعلیٰ تعلیم پر بھی چڑھائی کی ہے اور وہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں اسے ایک کمزور کڑی کے طور پر دیکھ رہے ہیں۔ ہاروویٹز ''نوجوان امریکی'' (Young Americans) اور کالج ریپبلکنز (college republicans) جیسی بہت سی قدامت پسند طلبا جماعتوں کا سربراہ ہے جنہیں بے شمار مالی امداد، توجہ اور حفاظت میسر ہے۔ یہ جماعتیں اکیڈمک بل آف رائٹس (Academic Bill of Rights) کے لیے حکمت عملی بنانے کی کوششوں کو بنیاد فراہم کرتی ہیں، جس کے ذریعے وہ سیاسی تعصب جیسے دلچسپ لیکن کم پائے جانے والے جذبات کو بھی کالج کے کمرۂ جماعت سے نکال باہر کرنا چاہتا ہے۔ ان کوششوں کے نتائج یہ حاصل ہوئے کہ بہت سی ریاستوں میں جامعاتِ علمی کو خود ساز حکمتِ عملی اور طریقۂ تعلیم وضع کرنے کی آزادی سے متعلق ہونے والی قانون سازی کی سماعت پر ایک بڑی عوامی دولت کو وقف کر دیا گیا۔ یہ نظام اب بدتر ہوتا جا رہا ہے۔ کیلی فورنیا یونیورسٹی میں بروئن الومینائی ایسوسی ایشن(The Bruin Alumni Association) نے اپنی ویب سائٹ پر ایک مضمون درج کیا ہے جس کا عنوان ہے ''تیس گندے''(The Dirty Thirty) جن میں جامعہ کے سب سے زیادہ انتہا پسند اساتذہ کو نشانہ بنایا گیا ہے۔ اس گروہ کے مطابق انتہا پسند کا مطلب عراقی جنگ سے متعلق مخالفانہ نظریات رکھنا، اور صدر بش، ری پبلکن پارٹی، کثیر قومی کاروباری اداروں اور ''ہمارے جنگجو مردوں اور عورتوں'' کے خلاف بات کرنا ہے۔ اس جماعت کا سربراہ اینڈریو جونز دائیں بازو کے نظریات کا پیرو اور کیلی فورنیا یونیورسٹی کی طلبہ جماعت بروئن ری پبلکنز کا سابق چیئرمین ہے، اور جس کا مقصدِ کار جامعہ سے بڑھتی ہوئی سیاسی انتہا پسندی کو منظر عام پر لانا اور اس کا تدارک کرنا ہے۔ جونز اپنے آقا ہاروویٹز سے بھی کہیں زیادہ شدت پسند ہے۔ ہاروویٹز (جو کہ ایسی تنظیم کا سربراہ ہے جس کا کام قومی سطح پر بائیں بازو کے حامی اساتذہ کی نقل و حرکت پر نظر رکھنا ہے)، کو ایک دفعہ جونز کو اس لیے جماعت سے نکالنا پڑا کہ وہ بائیں

بازو کے حامیوں کے بارے میں جھوٹی خبریں پیش کرنے کے لیے طلبہ پر دباؤ ڈال رہا تھا۔ بروئن الومینائی ایسوسی ایشن توازن قائم کرنے کی صدا کے ذریعے عدم برداشت اور مخالفتِ دانش پھیلانے کے علاوہ بھی اور بہت کچھ کرتی ہے۔ یہ ایسے کسی بھی طالب علم کو جو اپنے اساتذہ کے سیاسی خیالات کے متعلق معلومات فراہم کرنے کے لیے تیار ہو، ایک سو امریکی ڈالر کا انعام دینے کی پیشکش کرتی ہے۔ قومی سطح پر ہونے والی غیر اخلاقی اور غیر قانونی سراغ رسانی، جس کی جونز جیسے دائیں بازو کے طلبہ کو مذمت کرنی چاہیے، یوں لگتا ہے کہ جیسے ایک لائحہ عمل کے طور پر پیش کی جا رہی ہے جس کے تحت اساتذہ کو دھمکایا جاتا ہے، طلبہ کے ساتھ ایسے تحقیری طریقے سے پیش آیا جاتا ہے کہ جیسے وہ کوڑھ مغز ہیں اور طلبا کو کمرۂ جماعت میں شرکت کے ایسے طریقے بتائے جاتے ہیں جو کہ ۱۹۳۰ء کے فسطائی اور نازی سراغ رسانوں کی چالوں سے مشابہ ہیں۔ اعلیٰ تعلیم اب تنقیدی خیالات کے خزانے، بحث مباحثہ اور باخبر شہریوں کی بہتری کی اہمیت سمجھنے کے بجائے کم ہوتے ہوتے صرف ملازمت کے قواعد وضوابط یا حب الوطنی کے نظریاتی تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کی تربیت رہ گئی ہے۔ لیکن صرف تربیت کو تعلیم کا متبادل بنا دینے اور نظریاتی ہم آہنگی کو تنقیدی سوچ سے بدل دینے کے علاوہ اور بہت کچھ بھی خطرے میں ہے۔ اعلیٰ تعلیم قومی سلامتی کی مضبوطی میں مرکزی کردار بھی ادا کر رہی ہے۔ جامعات اب وسائل مہیا کرتی ہیں، ٹھیکوں پر تحقیق کرنے میں مصروف رہتی ہیں اور انتہائی بے شرمی سے امریکی حکومت کو حفاظتی اقدامات کی توسیع کے لیے کارکنان، ماہرین اور ضروری آلات مہیا کرتی ہیں اور بدلے میں دفاعی ٹھیکوں کے لیے وقف کیے گئے مال کا ایک بڑا حصہ وصول کرتی ہیں۔

تعلیم جس حصار کا شکار ہے اس میں ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم اس کے صرف دو اجزاء ہیں۔ ذرائع ابلاغ اور دوسرے بہت سے ادارے جن کا مقصد عوام کو خواندہ بنانا ہے اور جو بڑی ثقافت میں تعلیم کی قوت دکھا سکتے ہیں، آج کل تنقیدی ہونے یا حب الوطنی کے راستے پر نہ چلنے کے باعث حملوں کا شکار ہیں۔ منڈی کی بنیاد پرستی اور حکومتی ڈراوے کے زیر اثر غالب ذرائع ابلاغ ٹوٹ پھوٹ کر تجارت پسندی، دروغ گوئی، مذہبی انتہا پسند ٹیلی وژن اور تفریح کی دلدل میں گر گیا ہے۔ ایسی صورت حال میں ذرائع ابلاغ نہ تو چوتھے تعلیمی ادارے کے طور پر عوامی بھلائی کے لیے کام کرتا ہے اور نہ تنقید پسند شہری پیدا کرنے یا سچی جمہوریت

کے دفاع کے لیے ضروری تعلیمی اصول ہی مہیا کرسکتا ہے بلکہ اس کے برعکس ذرائع ابلاغ سیاسی ثقافت سے سیاست کوختم کرتا، شہریوں پر تجارتی بنیادوں پر (دلوں میں) دھنس جانے والے بم گراتا اور عوامی زندگی کو توڑتا ہے۔ عوامی خدمت کا اہم فریضہ سرانجام دینے کے بجائے وہ ہم آہنگی اور جی حضوری کی ثقافت کوفروغ دینے کے لیے اولین آلۂ درس بن جاتا ہے جس کے ذریعے عوام کو غلط معلومات دی جاتی ہیں۔ اور یوں عوامی خیالات و بحث مباحثے کی شکل بدل دی جاتی ہے۔

کلیئر چینل کمیونی کیشنز (Clear Channel Communications) اور روپرٹ مرڈوچ (Rupert Murdoch) کی نیوز کارپوریشن (Fox News) جیسے دیوقامت ذرائع ابلاغ کے انبار عوام کی ایسی تدریس کرنے میں مصروف ہیں جس میں حکمران طاقتوں کو بجائے اخلاقیات اور سیاست کے بلندترین معیار پر جواب دہ بنانے کے انہیں قانونی ثابت کرنے میں لگے ہیں۔ اس طرح یہ غالب سیاسی اور کاروباری مفادات کی تشہیر کا آلۂ کار بن کررہ گئے ہیں۔ ایسے ذرائع ابلاغ نے آراء تک عوام کی پہنچ کو محدود کردیا ہے اور اس طرح تنقیدی تبادلۂ خیال اور مضبوط عوامی بحث مباحثے کے امکانات کو معدوم کر کے جمہوریت کو کمزور بنا دیا گیا ہے اور اگر اس طرح کے تنقیدی خیالات جامعات، ذرائع ابلاغ یا دوسرے تعلیمی مقامات پر سامنے آ بھی جائیں تو انہیں بائیں بازو کی دہشت زدہ کرنے والے خوف اور سلامتی کے نعروں کی مہم کے ذریعے حملوں کا نشانہ بنایا جارہا ہے تاکہ جواب دہی سے بچا جاسکے اور ایسے خطرناک خیالات پیش کیے جارہے ہیں کہ ایسی تنقید غیر امریکی فطرت ہی نہیں غداری وطن کے مصداق بھی ہے۔ اس طرح کے الزامات لگا کر بش حکومت نے دہشت گردی کے خلاف بے قابو جنگ میں ملک دشمن اور عام شہری کے درمیان فرق کو مٹا دیا ہے اور اس طرح بیسیویں صدی کے اواخر میں پیرو (Peru) جیسے ممالک میں پائی جانے والی آمریت کو جنم دیا ہے۔ بش کی دنیائے نیک و بد میں حاکمِ علی الاطلاق کی درخواست کھلم کھلا تحقیقات اور حقیقی و خالص سوچ بچار کا راستہ روک رہی ہے۔

دائیں بازو کے زیر اثر ذرائع ابلاغ کے غالب طبقہ کی مدد سے بش اور ڈِک چینی کے گروہ نے عراق جنگ اور بش انتظامیہ کی گرتی ہوئی داخلی حکمتِ عملیوں پر ہونے والی معتبر تنقید کو بارہا الزامات کا نشانہ بنایا اور عوام کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ ایسے ناقدین دراصل دہشت گردوں کو مدد فراہم کرتے ہیں۔

الزامات سے نشانہ بنانے والی چال اس وقت واضح نظر آتی ہے جب پال وولف وِوٹز ۲۰۰۴ء میں ایسی تنقیدی خبروں کو افواہ کا نام دیتا ہے جن میں عراق میں بڑھتی ہوئی بغاوت کے باعث امریکی فوجی دستوں کے خوفزدہ ہونے پر تنقید کی گئی تھی۔ بش انتظامیہ نے اپنی طاقت کے تحفظ کے لیے ہر ممکن کوششیں کیں۔ کبھی وہ ناقدین پر ''غیر ذمہ دار'' اور ''غیر امریکی'' رویہ دکھانے کا الزام لگاتے ہیں اور کبھی اپنی ہی خبروں کو جھوٹا کہہ کر پراپیگنڈا کرتے ہیں۔ انہوں نے آرمسٹرانگ ولیمز جیسے قدامت پسند صحافیوں کو بش انتظامیہ کے داخلی اور خارجی امور کے بارے میں نظریات کے حق میں کہانیاں گھڑنے کے لیے رشوت دینے سے بھی گریز نہ کیا۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے حکومت کی نااہلی، ناکامیوں، بدعملیوں اور جھوٹ جیسے انکشافات سے عوام کی توجہ ہٹانے کے لیے ''فوکس نیوز'' کو بھی استعمال کیا۔

جب ایسی ترغیبات اور شرمناک تدابیر بھی ناکام ہوگئیں تو بش انتظامیہ نے تشدد آمیز اور عقوبتی ہتھکنڈے استعمال کرنے شروع کر دیے۔ جب خوف، حُبّ الوطنی اور قومیت جیسی پرزور التجا کا بھی عوام پر خاطر خواہ اثر نہ ہوا تو ناقدین کو خوف زدہ کیا گیا اور انہیں سزائیں دی گئیں۔ مثلاً جب ''نیویارک ٹائمز'' نے انکشاف کیا کہ بش انتظامیہ نے قومی ادارہ برائے سلامتی (National Security Agency) کو اجازت نامہ کے بغیر امریکی شہریوں کی ٹیلی فون پر ہونے والی بات چیت کو ریکارڈ کرنے کے لیے استعمال کیا، تو صدر بش نے اس انکشاف کو شرمناک کہتے ہوئے محکمہ انصاف سے درخواست کی کہ اس معاملے کو منظرعام پر لانے والے بھیدی کے خلاف تفتیش کریں۔ اس سے تو یوں لگتا ہے جیسے اصل جرم لاقانونیت نہیں بلکہ حکومتی بداعمالیوں کا انکشاف ہے۔ یہ حقیقت اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ بش کے نزدیک عوام کی گفتگو ریکارڈ کرنے کا انکشاف کرنے والے ناقدین القاعدہ کو مدد اور آسانی فراہم کرنے کے مجرم ہیں۔ ''دی نیشن'' اخبار کے اداریہ کے مطابق اگر یہ انکشاف غداری ہے تو بش انتظامیہ کے بہت سے اہلکاران غداروں میں شامل ہیں اور ''نیویارک ٹائمز'' کا یہ انکشاف کسی آنے والے طوفان کا پیش خیمہ ہے۔ حکومت کی معتبر تنقید کے خلاف نفرت کا اظہار بش انتظامیہ کے سابق سفیر جوزف ولسن کو سزا دینے کی کوششوں سے ہوتا ہے، جس نے عراق جنگ کی وجوہات کے بارے میں حکومتی دلائل کو غلط قرار دیا تھا۔ ان تمام واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ بش انتظامیہ ان تمام جمہوری ذرائع کو بھرپور انداز میں کچل رہی

ہے جو حکومت کا محاسبہ کر سکتے ہیں۔

ہم یقیناً ایک تاریک دور سے گزر رہے ہیں۔اب جب کہ تعلیم کی قوتِ تنقید، مختلف عوامی حلقوں میں سرکاری بیانات کی پیروی، مطابقت اور جبری تعظیم و تکریم تک محدود ہو کر رہ گئی ہے، عوام کے لیے تنقیدی مباحثوں کا اہتمام کرنا، ذاتی مایوسیوں کو حکومت کی حکمتِ عملی کی ناکامیوں کے ساتھ جوڑنا اور موجودہ حکومت کی غلط بیانیوں اور دروغ گوئیوں کو پہچاننا مشکل تر ہو گیا ہے۔عراق پر امریکی حملے کی وجوہات کے بارے میں بش کے ننگے جھوٹ، ٹیکس نظام میں اصلاحات کے لیے ایسی حکمت عملیاں اپنانا جو متوسط اور نچلے طبقے کی قربانی دے کر امیر ترین طبقے کو فائدہ پہنچائیں اور ایسی خارجہ حکمتِ عملیاں تشکیل دینا جسے باقی دنیا دھونس جمانے سے تعبیر کرے، چند ایسے عوامل ہیں جن کے ہوتے ہوئے بش کا انتخابات میں دوبارہ کامیاب ہو جانا کسی معمے سے کم نہیں۔ مزید یہ کہ بش انتظامیہ کا لاکھوں نوجوانوں کو بے روزگاری، غربت اور مایوسی کی طرف دھکیل دینا، صحتِ عامہ اور ماحول کی حفاظت کے لیے بنائے گئے قوانین کے خلاف کارروائیاں کرنا اور امریکی قوم کے شہری آزادی کے عزیز ترین نظریہ کو پس پشت ڈال کر خوف کے تمدن کو ضابطہ بنا کر نافذ کرنا بھی اس کی عوامی حمایت کے ذریعے دوبارہ منتخب ہونے میں رکاوٹ نہ بن سکا۔

تنقیدی خیالات کو ضرر پہنچانے سے امریکہ میں ایسے بہت سے غیر جمہوری رجحانات جنم لے رہے ہیں جن کا تعلق یک طرفہ فیصلوں، ذاتی مفادات، بش انتظامیہ میں موجود کھلم کھلا بدعنوانیوں سے ہے جو اس کی انتظامی قوت کو مزید تقویت دینے کے لیے کی جاتی ہیں اور جس سے عدلیہ کو نقصان پہنچایا جا رہا ہے۔ انہی رجحانات کے نتیجے میں بش انتظامیہ انسانی حقوق کو لاگو کرنے والے عالمی اداروں اور فوجداری عدالتوں کو واضح طور پر نظر انداز کرنے کی جرأت کر سکی ہے۔

بش انتظامیہ کے وسیع تر طاقت کے حصول اور استعمال کے غیر جمہوری رجحانات میں سے یک جماعتی نظام کا بڑھنا، رائے دہی کے قوانین کو منفی طریقوں سے استعمال کرنا، انتخابات کے دوران مخالفین کے ووٹروں کو دھمکانا، رائے دہی کے نظام میں دھوکا دہی کرنا، اقربا پروری کا پروان چڑھانا، سیاسی بدعنوانیاں کرنا، ریپبلکن جماعت کو چندہ دینے والے افراد کو حکومتی ٹھیکے دینا، دائیں بازو کے بہت سے

راسخ العقیدہ عیسائی حمایتیوں کوان کی نااہلیوں کے باوجود حکومت کے لیے حکمت عملیاں تشکیل دینے سے متعلق عہدوں سے سرفراز کرنا، ہم جنس پرستی اور ہم جنس پرستوں کے خلاف نفرت اور تعصب، نسلی اور جنسی تعصب کا پروان چڑھنا، صرف چند ایسے افعال ہیں جو امریکی زندگی پر اثر انداز ہورہے ہیں۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ نے بھی نسلی تعصب کے ایسے روپ کو جنم دیا ہے جو استعماری اور نو آبادیاتی نظام کا حصہ رہی ہیں۔ امریکی تہذیب کے لیے خطرہ ثابت کرکے قومیت اور حب الوطنی کی بحث نے نسلی تعصب کا رویہ امریکی تمدن کا حصہ بنادیا ہے۔

سیموئیل پی ہنٹنگٹن، لُوڈوبزا اور پیٹ روبرٹسن جیسے سیاسی مفکرین کبھی ہسپانویوں کو خطرہ گردانتے ہیں، کبھی مہاجروں کے حکومت میں آنے سے خوفزدہ ہوتے ہیں اور کبھی کھلے عام مسلمانوں کو نازیوں سے بدتر قرار دے کر نسلی تعصب کی بڑھتی ہوئی بحث کو میکسیکو سے آنے والے مہاجروں، عربوں، مسلمانوں اور دوسری بہت سی قوموں کی طرف موڑ دیتے ہیں جن پر الزام یہ ہے کہ وہ امریکی تہذیب کی انفرادیت کے لیے خطرہ ہیں۔ باہر سے آنے والے مہاجرین پر امریکیوں سے نوکریاں چھیننے اور امریکہ کے خلاف دہشت گردی کی کارروائیوں میں مدد کرنے کا بھی الزام لگایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ شہریوں کی چھان بین کا ایک ایسا نظام قائم کردیا گیا ہے جو عدالتی دائرہ اختیار سے باہر ہے۔ تشدد، اغواء اور لوگوں کو غائب کروانے، جیسی انسانی حقوق کی پامالی اور مبالغہ آمیز قومیت کے تصور کو نسلی تعصب کی آگ نے اس قدر بڑھادیا ہے کہ جیسے جیسے قومی سلامتی، جرائم اور اپنے ہی شہریوں کی نگرانی امریکی قوم پر غالب آتی جارہی ہے۔ مہاجرین کو امریکیوں کی نوکریوں، حفاظت اور امن وامان کے لیے خطرہ سمجھا جانے لگا ہے۔

اس طرح کے قول وفعل نے امریکہ کو ۱۹۷۰ء میں حکومت پر قبضہ کرنے والے لاطینی امریکہ کے آمروں جیسا بنادیا ہے جنہوں نے خوف، سلامتی اور غیر قانونی رویوں کو تشدد، بدسلوکی اور اغواء جیسی بربریت کا عذر پیش کرنے کے لیے عوام کے سامنے رکھا تھا۔ مصنفہ ایزابیل ہلٹن بش کی موجودہ انتظامیہ کے بارے میں انکشاف کرتے ہوئے لکھتی ہے:

''جمہوری ملکوں کی قانونی حکومت کا یہ بنیادی اصول ہوتا ہے کہ کوئی ریاست کسی انسان کو قانون کے سامنے جواب دہ کیے بغیر نہ قید کرسکتی ہے نہ قتل کرسکتی ہے۔ لیکن صدر بش نے اس اصول کو صرف

نظر انداز ہی نہیں کیا بلکہ وہ اس اصول کے پاسدار ہونے کا دم بھی بھرتا ہے''۔

اس غیر معمولی طور پر انسانی حقوق کی پُرفریب پامالی، اول الذکر غیر جمہوری رجحانات، غالب ہوتی ہوئی مبالغہ آمیز قومیت کا تصور، اور بے قابو عسکریت کا ظہور ایسے چند عوامل ہیں جو مل کر امریکہ میں مطلق العنانیت کے فروغ کو مزید واضح کرتے ہیں۔

عوامی زندگی میں بڑھتی ہوئی عسکریت چوتھا غیر جمہوری عقیدہ ہے جو پہلے بیان کیے گئے عوامل کو مزید تقویت دیتے ہوئے امریکی معاشرے کو ایک نئی شکل دے رہا ہے۔ نمودار ہوتی ہوئی یہ عسکریت جسے ڈیوڈ تھیو گولڈ برگ ''سچ کے نئے نظامِ حکومت'' سے تعبیر کرتا ہے، ایک نیا نظریۂ علم ہے جو حقیقت اور افسانہ، صحیح اور غلط، اور منصفانہ اور غیر منصفانہ میں تمیز کرنا سکھاتا ہے۔ عسکری قوت کا حصول نہ صرف امریکیوں کے سروں پر سوار ہو گیا ہے بلکہ یہ ان کی قومی شناخت کا بنیادی محور و مرکز بن کر رہ گیا ہے۔ کیونکہ اس کے علاوہ شاید اس حقیقت کی توجیہہ پیش کرنا مشکل ہے کہ امریکہ کے بیرون ملک ۷۲۵ اور اندرون ملک ۹۶۹ فوجی اڈے ہیں یا اس امر کی کہ امریکہ کے دفاعی اخراجات دنیا کے تمام ممالک کے مجموعی دفاعی اخراجات سے زیادہ ہیں۔ جنگ سے متعلقہ افواہیں، جنگی مناظر، نظریہ پیشگی ضرب (pre-emptive strike)، جنگ برائے حفظ ما تقدم، عسکری ہدفی جنگ، مانع امراض جنگ اور مستقل جنگ جیسی اصطلاحات کا کثرت سے استعمال اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ جنگ اس قوم کے دماغ پر حاوی ہو چکی ہے۔ ایسے ممالک کے خلاف جو صرف دشمن دکھائی دیتے ہیں، نظریۂ پیشگی ضرب کو یک طرفہ طور پر قانونی قرار دے کر بش نے ایک ایسی مستقل جنگی حکمت عملی اپنائی ہوئی ہے جس نے نہ صرف مطلق العنانیت کی طرف قدم بڑھانے کے لیے خطرناک مثال قائم کر دی ہے بلکہ دوسری دائیں بازو والی قوموں کو یہ شہ بھی دی ہے کہ وہ بھی انہی پیرائیوں پر حکمتِ عملیاں تشکیل دیں۔ نہ صرف ۱۳ اپریل ۲۰۰۴ء کو صحافیوں سے گفتگو کرتے ہوئے صدر بش نے وضاحت کی بلکہ اس کے بعد بھی ۲۰۰۶ء تک بار بار اس امر کو دہرایا کہ ''اس ملک کو جارحیت کو اپنانا ہوگی اور جارحیت پر قائم رہنا پڑے گا''۔

یہ سمجھتے ہوئے کہ عسکری قوت و طاقت ہی معاشرتی سچائی اور قومی عظمت کے اظہار کا بہترین ذریعہ ہیں، بش انتظامیہ نے امریکی عسکری تاریخ میں ایک خطرناک باب کا اضافہ کر دیا ہے جو ایسے نظریے کی

آزادانہ حمایت کرتا ہے جسے سی رائٹ ملز ''عسکری فلسفے'' کا نام دیتا ہے۔ یہ نظریہ ایسا رجحان پیدا کرتا ہے جس میں دنیا کے مسائل عسکری مسائل نظر آتے ہیں اور عسکری ذرائع استعمال کیے بغیر ان کا حل ہونا مشکل دکھائی دیتا ہے۔ اس طرح کی جارحانہ عسکریت نے خارجہ حکمتِ عملی کا نصبُ العین ان بنیادوں پر کھڑا کر دیا ہے جنھیں کارنیل ویسٹ (Cornel West) ''کاؤ بوائے کے امریکی سرحد کے خواب کی دیومالائی داستان'' کہتا ہے۔ یہی نصبُ العین داخلی حکمتِ عملیوں پر کچھ اس طرح اثر انداز ہو رہا ہے کہ پولیس کے اختیارات بڑھا دیے گئے ہیں، قید خانوں کا ایک جال بچھا دیا گیا ہے اور بے لگام شخصی طاقت اور تشدد کو نجی اور کاروباری زندگی میں قانونی طور پر جائز قرار دے دیا گیا ہے۔ یہ نظریہ جرم کو بجائے بدطینت رویے کے طور پر دیکھ کر ان رویوں کی افزائش کرنے والے محرکات کا سدباب کرنے کے اسے ایک بڑے دشمن کے طور پر لیتا ہے جس کا نشانہ عموماً غریب بنتے ہیں۔

امریکی تمدن اب عسکری حقائق، اقدار، سماجی تعلقات اور عسکری شناخت کے زیر اثر رہ کر انفرادیت بھی حاصل کر رہا ہے اور پنپ بھی رہا ہے۔ بڑی جامعات شعبۂ دفاع سے تحقیق کے لیے رقم حاصل کرنے کے مقصد سے عسکری انتظامیہ کی پرزور خوشامد کر رہی ہیں اور اس دھینگامشتی میں اپنے ان علمی موضوعات یا پروگراموں کا دائرہ محدود کر رہی ہیں جو زبردست مباحثوں، مکالموں اور تنقیدی سوچ وبچار کو ابھارنے میں مدد دیتے ہیں۔ دراصل بش انتظامیہ اور اس کے جنگ پسند حمایتی دونوں اعلیٰ تعلیمی اداروں پر دباؤ ڈال رہے ہیں کہ وہ عسکری صنعتی کمپلیکس کی ضروریات کو پورا کرنے میں تعاون کریں جس کے نتیجے میں جامعات قومی سلامتی کے اداروں کے ساتھ ایسے طریقوں سے اپنے تعلقات بڑھا رہی ہیں جن کا کھلم کھلا جشن منایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر پینسلوینیا سٹیٹ یونیورسٹی، کارنیگی میلن یونیورسٹی، یونیورسٹی آف پینسلوینیا، جان ہاپکنز یونیورسٹی اور مزید بہت سی نامور جامعات قومی سلامتی اداروں کا دائرہ اثر وسیع کرنے کی خاطر مرکزی تفتیشی ادارے کے ساتھ بڑی بے شرمی سے باقاعدہ معاہدے کر چکی ہیں تاکہ تحقیقی میدان میں نمایاں جامعات کا تعلق حکومتی نمائندہ اداروں کے ساتھ جوڑا جا سکے۔

جیسا کہ پینسلوینیا سٹیٹ کا صدر گراہم سپینئر ایک طنزیہ بیان میں اس موضوع پر دلیل پیش کرتا ہے کہ قومی سلامتی اور اعلیٰ تعلیمی مشاورتی بورڈ (جس کا وہ خود سربراہ ہے)، نے ''ایک مثبت پیغام بھیجا ہے کہ

اعلیٰ تعلیم سے متعلقہ سربراہان امتحان کی اس گھڑی میں قوم کی مدد کرنے کے لیے تیار ہیں''۔

اس طرح کی توضیحات پڑھ کر بالکل یہی محسوس ہوتا ہے کہ جیسے جارج اورویل کی کتاب ''۱۹۸۴ء'' کا کوئی صفحہ پڑھا جا رہا ہو جس میں وہ ہر اس شائستہ اور جمہوری اقدار کا دفاع کرتا ہے جو اعلیٰ تعلیم کو جمہوری عوامی حلقہ ثابت کرتی ہیں۔ شاید سپینر اپنے عہدے کے اختیارات اور جامعہ کے ذرائع کو ایف بی آئی کے داخلی جاسوسی کے وسیع تر منصوبہ کو درپیش مسائل کے حل کے لیے استعمال کر سکے؛ سی آئی اے کے بیرون ملک قائم اذیت ناک قید خانوں، جنہیں ''اندھیری کوٹھڑیاں'' کہتے ہیں کے لیے نئی کھیپ مہیا کر سکے؛ یا شاید ''خصوصی تعذیبی پروگرام'' کے لیے کام کرنے والے تکنیکی ماہرین کو تربیت دے سکتے ہیں جس کا مقصد دہشت گرد ملزمان کو بیرونِ ملک اغواء کر کے ایسے ملکوں میں بھیجنا ہے جو قانونی حقوق اور شہری آزادیوں کی پرواہ نہیں کرتے۔ یا شاید سپینر اور اس کے رفقاء عظیم جامعات کے وسائل کو ان مسلمان اور عرب طلباء کے متعلق معلومات پہنچانے کے لیے پیشکش کریں گے جو امریکہ کے لیے بڑا خطرہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ شاید وہ ان طلباء اور اساتذہ کے بارے میں بھی معلومات مہیا کر سکیں جن پر بش کی داخلی اور خارجی حکمتِ عملیوں کی مخالفت کر کے اسی قسم کی دہشت پیدا کرنے کا الزام ہے۔ اگر اسے بہتر نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو شاید سپینر اور اس کے ساتھی ایف بی آئی کے لیے بڑا ہی بے تکلف تبصرہ اور اہم مشورہ بھی دے سکیں کہ ایف بی آئی ان حالیہ انکشافات سے کیسے نمٹ سکتی ہے جن میں اندرونِ ملک جاسوسی کے ذریعے اس کے کردار کو سامنے لایا گیا یا یہ کہ وہ اس بچی کھچی یاد کو کیسے ختم کرے جو جنگ کے خلاف مظاہرہ کرنے والوں، شہری حقوق کے لیے سرگرمِ عمل لوگوں اور اختلافِ رائے رکھنے والے دوسرے خطرات کو ڈرانے دھمکانے اور ان کی جاسوسی کرنے کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں ابھی تک باقی تھی۔

بدقسمتی سے عوامی سکولوں کے ساتھ بھی مستقل جنگ کے اس دور میں کچھ بہتر سلوک نہیں ہو رہا۔ عوامی سکولوں میں نہ صرف یہ کہ فوج میں بھرتی کرنے والے زیادہ ہیں بلکہ ان میں پڑھانے والوں میں بھی فوجی اہلکار اچھی خاصی تعداد میں ہیں۔ منڈی کی جدید آزاد خیالی کی منطق کے موجودہ انتظامیہ کی عسکری منطق کے ساتھ مل جانے سے عوام کے مقصدِ تعلیم میں بڑی بنیادی تبدیلی آ گئی ہے، کیونکہ اب محنت کش

طبقہ بے فائدہ ہو گیا ہے۔ عدم برداشت کی حکمتِ عملیاں (جنہوں نے شہری سکولوں کو قید خانے بنا دیا ہے)، نافذ کرنے سے سکولوں نے ''پرتشدد محبت'' کی منطق کو اپنا لیا ہے جس کے ساتھ ساتھ عسکری انداز کے نظم و نسق نے طلباء کے حقوق بڑی تیزی سے تقریباً معدوم کر دیے ہیں۔ بالخصوص غریب شہری اور دیہاتی علاقوں کے بہت سے سکولوں کے طلباء کی تلاشی لی جاتی ہے، انہیں دھمکایا جاتا ہے، ان کی مرضی کے بغیر طبعی معائنہ کیا جاتا ہے، چھڑی سے پیٹا جاتا ہے اور چھکڑوں میں ڈال کر حوالات بھیج دیا جاتا ہے۔ یہ کوئی خاص ڈھکا چھپا نصاب نہیں کہ کچھ خاص بچے بڑی بُری سماجی سرمایہ کاری ہیں؛ ان پر اعتبار نہیں کیا جاتا، مشفعانہ طور پر ان کے چلنے پھرنے کو نظر میں رکھا جاتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ ان کے حقوق اس قابل نہیں کہ ان کا تحفظ کیا جائے۔ مثال کے طور پر ''کوئی بچہ بچنے نہ پائے ایکٹ'' (No Child Left Behind Act) مطالبہ کرتا ہے کہ اسکول طلبہ کی ذاتی زندگی سے متعلقہ معلومات فوج میں بھرتی کرنے والے افراد کو فراہم کی جائیں جسے وہ اس وقت استعمال کر سکیں گے جب یہ طلبہ فوج میں شمولیت اختیار کر لیں۔ یہ بھرتی کار سکولوں کے برآمدوں میں پھرتے ہیں اور رہنما مشیر کے طور پر ہر جگہ نظر آتے ہیں؛ سکول کے لیے بہت سی خدمات سرانجام دیتے ہیں؛ ویڈیو گیم کے مقابلے کروانے جیسے انوکھے طریقے استعمال کرتے ہیں اور نغمہ و سرود کی محفلوں کی سرپرستی کرتے ہیں تاکہ بھرتی کا کوٹہ مزید وسیع ہو سکے۔

شکاگو پبلک سکول سسٹم کے تقریباً ۵۰ فیصد جونیئر اور سینئر ہائی سکول ''تربیت برائے دستۂ جونیئر افسرانِ محفوظہ'' (Junior Reserve Officers' Training Corps) جیسے منصوبوں کی حمایت کرتے ہیں جبکہ شکاگو کے دوسرے بہت سے سکول عسکری تربیت گاہ کے طور پر استعمال کیے جا رہے ہیں۔ بھرتی کے سلسلے میں کی گئی اس جدوجہد کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۲۰۰۴ء میں فوج بھرتی کی اس مہم کو سڑکوں پہ لے آئی جس کے دوران افریقی نژاد نوجوان امریکیوں اور لاطینیوں کو فوج میں شمولیت کی ترغیب دینے کے خیال سے سازوں اور مشہور ویڈیو گیم ''امریکی فوج'' سے سجے ہوئے قافلے کو شہر کے مرکزی علاقوں میں پھرایا گیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ غریب اقلیتی نوجوان ایسے حربوں سے کلی طور پر متاثر نہیں ہوئے کیونکہ ان اقلیتوں کے نوجوانوں کو قید کرنے کی شرح انتہائی سطح تک پہنچ گئی ہے اور سکولوں، ہسپتالوں اور زندگی بچانے والے دوسرے اداروں کی تعمیر قید خانوں کی تعمیر سے کہیں کم ہے۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ بش انتظامیہ ملک کو خوف، عدم رواداری، جہالت اور مذہبی اصولوں کے درمیان تقسیم کر کے حکومت کر رہی ہے جس کی وجہ سے جمہوریت کا مستقبل روشن نظر نہیں آتا۔ ناقد و مفکرِ نسلیات ڈیوڈ تھیو گولڈ برگ بالکل ٹھیک خیال پیش کرتا ہے کہ بش کے دوبارہ صدر منتخب ہونے کا مطلب اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ:

> ''بیمار نہیں پڑو بلکہ نوکری گنوا دو یا ریٹائر ہو جاؤ؛ سانس مت لو، سمندر میں تیراکی کرو، سفر کرو یا صرف تنقیدی خیالات ہی سوچو؛ اپنی زندگی کی جمع پونجی سٹاک مارکیٹ میں لگا دو چاہے تم یہ سب کچھ کھو دو؛ یونیورسٹی میں چار سال مت پڑھو جہاں تمہیں آزاد خیال بنا دیا جائے گا بلکہ دو سال کمیونٹی کالج میں تکنیکی تربیت حاصل کرو؛ امیروں کے لیے بنائے گئے ٹیکس نظام کی اور غریبوں کے فوج میں بھرتی ہونے کی حمایت کرو اور اگر تم ان اصولوں سے روگردانی کرو گے تو یاد رکھو حب الوطنی ایکٹ (Patriot Act) اندرونِ ملک تمہیں قابو کرنے کے لیے موجود ہے اور بموں سے بھرے ہوئے بی-۵۲ بمبار طیارے بیرونِ ملک آسمان پر منڈلا رہے ہیں''۔

عوام کے ساتھ وابستگی کے نظریۂ کمال سے غافل نئی مطلق العنانیت ایسے سیاسی اور معاشی افعال اور عسکری طرز کی ترجمانی کرتی ہے جس نے حقیقی جمہوریت، تنقیدی اداروں اور تنقیدی تعلیم کے درمیان قائم تعلق کو کمزور بنا دیا ہے۔ اس بڑھتی ہوئی مطلق العنانیت کے خلاف ساری دنیا کے ماہرینِ تعلیم کو (ترقی پذیر) سماجی تغیر و تبدل کو تعلیم کے ساتھ جوڑنے کی بھرپور کوشش کرنی چاہیے اور اس کے ساتھ ساتھ عوامی تعلیم و تعلم سے متعلقہ مختلف النوع علاقوں کو اکٹھا کرنا اور انہیں اچھے طریقے سے تنقیدی سوچ میں مشغول کرنا چاہیے۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ ایسے اتحاد بنائے جائیں جن میں اس امر کو یقینی بنایا جائے کہ سماجی زندگی کے ہر شعبہ کو سیاسی، سماجی اور ثقافتی جدوجہد کے لیے اہم سمجھا جائے کیونکہ یہ علم، شناخت، موزوں سرمایہ کاری اور سماجی تعلقات کو اپنی مرضی سے تبدیل کرنے کی کسی بھی انفرادی کوشش کے خلاف مدافعت کے لیے بھی انتہائی ضروری ہے اور حقیقی عالمگیر جمہوریت کی بنیادوں کو وسیع اور مضبوط کرنے کے لیے سیاسی افرادی قوت اور سماجی نمائندگان کی تشکیل بھی کرتا ہے۔

ایسے میں حالات تقاضا کرتے ہیں کہ تعلیم وتدریس میں ایسے اخلاقی اور سیاسی اصول اپنائے جائیں جو راسخ الاعتقادانہ ہونے کے بجائے رہبرانہ ہوں اور جو ایسی جدوجہد کو زندگی بخشیں جو سیاسی زندگی کے تیزی سے غیر سیاسی ہونے کے اس رجحان کے سامنے رکاوٹ بن سکتی ہے جو بش کے موجودہ انقلاب کی پہچان ہے۔ تعلیم ہی صرف ایک ایسی زمین ہے جہاں ضمیر کو سنوارا جا سکتا ہے، ضرورتیں پیدا کی جاتی ہیں، انفرادیت کے پہلوؤں اور وسیع سماجی تبدیلی کو اگایا اور پالا جا سکتا ہے۔ تعلیم کو زبان، اقدار اور نظریات کی آبیاری کرنے کے حوالے سے بہت زیادہ اہمیت حاصل ہوگئی ہے کیونکہ یہی عناصر ان اداروں اور تنظیموں کو قانونی تحفظ مہیا کرتے ہیں جو عالمی سرمایہ دارانہ نظام کے اصولوں کی معاونت کرتے ہیں۔ تعلیم کو تکنیک اور طریقۂ کار تک محدود کردینے کی کوششوں کو اگر فی الحال ایک طرف رکھ کر باقی صورتحال کا بھی جائزہ لیا جائے تو نظر آتا ہے کہ سیاسی اور تدریسی صورتحال کے لیے کاوشیں کرنے کے لیے تعلیم بہرحال اپنی اہمیت برقرار رکھتی ہے۔ اس سے لوگوں کو یہ موقع ملتا ہے کہ وہ ایسی تنظیم پیدا کریں جس کے ذریعے وہ اپنی روزمرہ زندگی کے رواجوں اور مقاصد کو ڈھالنے والی مادی قوت کے طریقۂ کار میں انفرادی اور اجتماعی طور پر شامل ہو کر اس پر اثر ڈال سکیں۔ موجودہ تاریخ کے تناظر میں طاقت کے حصول کی جدوجہد نے نہ صرف علامتی اور منطقی بلکہ مادی اور دستوری شکل بھی اختیار کر لی ہے۔

تعلیم پہ ہونے والی یہ چھینا جھپٹی مقاصد اور شناخت کے حصول کی کوشش سے بھی آگے کی بات ہے۔ اس جدوجہد کا تعلق اس طریقہ کار سے بھی ہے جس کے مطابق مقصد، علم اور اقدار کو پیدا کیا جاتا ہے، منظور کیا جاتا ہے اور قوت کے معاشی اور انتظامی معاملات میں استعمال کیا جاتا ہے۔ تعلیم کی سیاست سے کوئی مخالفت نہیں ہے۔ یہ تو سیاسی اصول وضع کرنے کے لیے ایک اہم اور بنیادی عنصر ہے۔ یہ نہ صرف مطلق العنانیت کی باضابطہ تنقید کے لیے نظریاتی آلہ فراہم کرتی ہے بلکہ یہ جمہوری وسماجی تبدیلیوں کے لیے حقیقی تحریک پیدا کرنے کے ممکنہ طریقوں کو زبان بھی دیتی ہے۔ اس کے علاوہ تعلیم ایک نئی حیاتیاتی سیاست بھی پیش کرتی ہے جس میں موت کے بجائے زندگی کو اہمیت دی جاتی ہے؛ خوف کے بجائے ذمہ داری کو بانٹا جاتا ہے، اور تحریکِ صارفین کو کچلنے کی بجائے شہریوں کو ساتھ ملا کر کام کیا جاتا ہے۔ یہاں سب سے اہم نقطہ یہ ہے کہ تعلیمی وتدریسی طریقۂ کار کو سمجھا جائے اور اس نظریہ کو پیش نظر رکھ کر انہیں مصروفِ کار

کیا جائے کہ تعلیم اور تدریس کس طرح طاقت کے وسیع تعلق کے ساتھ جڑتی ہیں۔ ماہرینِ تعلیم، طلبہ اور والدین پر یہ بات واضح ہونی چاہیے کہ طاقت کاغذوں، نمائندگیوں اور مباحثوں میں کس طرح کام کرتی ہے۔

اس کے ساتھ یہ سمجھنا بھی ضروری ہے کہ طاقت کو حتیٰ کہ سرکاری حکمتِ عملی کی سطح پر بھی صرف نمائندگی اور مباحثوں تک محدود نہیں کیا جاسکتا۔ ذہنوں کی تبدیلی تشدد کی اداراتی بنیادوں کی طرح نہیں ہے۔ بالکل اسی طرح سے اداروں میں اس وقت تک اصلاحات نہیں لائی جاسکتیں جب تک نہ صرف ناانصافیوں کے پہچاننے والے بلکہ اصلاحات کے امکان، حالات اور طریقۂ کار کا رُخ موڑنے کی طاقت کے حامل ذہن تبدیل نہیں ہوتے۔ مزید یہ کہ ایک طرف تدریس اور شہری تمدن کے درمیان تعلق کی بابت سوال اٹھانے بہت اہم ہیں اور دوسری طرف اس سوال کا نظریاتی حل نکالنا بھی کسی اہمیت سے کم نہیں کہ افراد اور سماجی گروہوں کو یہ کیسے یقین دلایا جائے کہ طبقہ، نسل، جنس اور غلبے کی دوسری بہت سی شکلوں جیسی حقیقتوں سے نبرد آزما ہونا ان کی بھی ذمہ داری ہے۔ ایک لمبے عرصے تک ترقی پسند اس حقیقت کو نظرانداز کرتے رہے ہیں کہ سیاست کے لائحہ عمل کا رخ تنقیدی تعلیم اور تدریس کے متعلق سوالات کے نہ ٹوٹنے والے تعلق سے جڑا ہوا ہے۔ وہ یہ حقیقت بھی پسِ پشت ڈالتے رہے ہیں کہ تعلیم کو ہمیشہ طاقت، اقدار، نظریات، اداروں کی کچھ خاص صورتوں اور کسی خاص نظریے کا مستقبل کے ساتھ برسرِ پیکار ہونے کو مان لینے کا کیا مطلب ہے؟

خوش قسمتی سے طاقت کبھی بھی تسلط، مذہبی انتہا پسندی اور سیاسی بدعنوانیوں کے ساتھ مکمل طور پر نہ رہ سکی، نہ ہی یہ مکمل طور پر اُن ہاتھوں میں رہی ہے جو جمہوریت کو زیادتی یا بوجھ سمجھیں۔ اس امر کی ضرورت ہے کہ ماہرینِ تعلیم ایک نئی بحث کا آغاز کریں اور ایسی عالمی سیاست کی بحالیٔ نو کریں جس کے مقاصد جمہوری تدریس اور سیاسی تمدن کو فروغ دینا ہو؛ ایک ایسی سیاست جو سماجی انصاف، برابری، اور وقت، خلا، طاقت، اجتماعیت، بحث و مباحثہ، شناخت، اخلاقیات اور مستقبل جیسے جمہوری حقوق کے اصولوں اور تمدنی ورثہ کی تجسیم کرسکتی ہو۔ لیکن اس طرح کی سیاست صرف قومی بنیادوں پر استوار نہیں ہوسکتی۔ اگر سیاست کو واقعی موثر بنانا ہے تو ایسے طریقے ڈھونڈنے پڑیں گے جس کے ذریعے انصاف اور مزاحمت دونوں کو عالمی

سطح پر لایا جا سکے؛ نئے ذرائع ابلاغ کو ایک اہم تدریسی ذریعہ کے طور پر استعمال کیا جا سکے اور مختلف مکتبہ فکر کے درمیان نئے اتحاد بنائے جا سکیں۔ اس کے علاوہ تدریس کو ایسے سیاسی عمل کے طور پر سنجیدگی سے لینا ہو گا جس کے سامنے سرحدیں رکاوٹ نہ ہوں، جو اختلافات کو قبول کرے، اور جو نئے عوامی منظر نامے کی جدوجہد کے لیے نئے اتحاد بنائے۔ یہ ایک خوش آئند حقیقت ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اور تحریکیں ملکی اور عالمی سطح پر طلبا، محنت کشوں، نظریہ حقوق نسواں کے سرگرم پیروکاروں، ماہرینِ تعلیم، مصنفین، تحفظ ماحولیات کے لیے سرگرمِ عمل افراد، عمر رسیدہ شہریوں، مصوروں اور دوسرے بہت سے شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد کو منظم کر رہی ہیں۔ یہ عالمی رجحان مطلق العنانیت کی سیاہ گہری گھائی میں خطرناک حد تک نیچے گرتے ہوئے امریکہ کے لیے ایک زبردست للکار ہے، کیونکہ یہ مطلق العنانیت اکیسویں صدی میں عالمگیر جمہوریت کے نہ صرف وعدے بلکہ حقیقی نظریے کے لیے بھی خطرہ ہے۔